اُردو نئے چیلنجز کی زد میں

ڈاکٹر محمد اویس قرنی

Dr.Muhammad Ovais Qarni

Peshawar University, Peshawar.

Abstract:

In this research article an effort has been made to show the importance of Urdu Serial. Urdu script is important for us because it has a relation with Quranic Script. Roman Script is not useful for Urdu writing. In this way we would be far away from our ancient heritage.

میرے دوست نے پاس بیٹھے ہوئے شخص سے کہا۔کل تمہارا میسج ٹھیک طرح سے نہ پڑھ سکا کیوں کہ اس میں غلطیوں کی بھرمار تھی۔اس نے جواب میں کہا۔وہ تو کسی اور کا لکھا ہوا تھا میں نے تو بس فارورڈ کر دیا تھا۔لیکن تمہارے بھیجے گئے شعر کے سپیلنگ بھی تو غلط تھے۔y کی جگہ u لکھا تھا c کی جگہ k اور G کی جگہ j۔یہ دیکھو پھول کا سپیلنگ بھی ٹھیک نہیں۔

''ارے یہ پھول نہیں پول ہے۔میں نے ڈھول کا پول لکھا تھا۔'' یہ دونوں ابھی ڈھول کے پول میں غلطاں تھے اور مجھے برسوں پہلے کے ایک گائیک کلاکار یاد آئے جو اُردو کے گیت پر اس وقت تک ریہرسل نہ کر سکے جب تک اس کے سامنے دیوناگری لپی نہیں رکھی گئی۔اس سے بہت آگے رسم الخط پر یہ ضرب ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ترکی میں پڑی تھی جب رومن کو رائج کر کے نئی نسلوں کو ایک گراں قدر کلاسیکی سرمائے سے محروم کیا گیا۔پھر برصغیر میں اس مسئلے پر بڑی بحثا بحثی ہوئی۔ تاہم اب کی بار جس صورتحال کا سامنا ہے وہ ناگفتہ بہ ہے کہ زبان تو کجا کسی کو مجروزیاں تک کا احساس نہیں۔ایک زمانہ تھا جب رومن رسم الخط کو رواج دینے میں عیسائی مشنری آگے آگے تھے۔ان کے خیال میں:

> ''اس سے انگریزی ترجمے اور تقلید کی کثرت ہو جائیگی اور بہت سے ہندوستانی عیسائی ہو جائیں گے اور ان کا خاص ہندی عیسائی ادب ہوگا۔اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لاطینی حروفِ تہجی کی لازماً ترقی ہوگی اور غالباً دوسری اقسام کے حروف سے سبقت لے جائیں گے۔''(۱)

گویا جو کام دن رات کی سرتوڑ کوششیں کر کے عیسائی مشنری نہ کر سکے وہ کارنامہ جدید سائنس اور کمیونیکیشن ریولوشن نے راتوں رات اس خوش اسلوبی سے کر دکھایا کہ ہر شخص کی جیب میں کچرے سمیت وہ سارے لفظ مع اصوات ولغات پہنچ چکے ہیں جن کے نفاذ میں بدیسیوں کو صدیاں لگیں۔اب سے بہت دور رومن رسم الخط کی حمایت میں جو دلیلیں لائی گئیں ان میں برصغیر کی دوسری زبانوں (بالخصوص اردو) کو ناقص گردانتے ہوئے مضحکہ خیز اعتراضات کیے گئے جیسے:

> ''اس میں لفظوں اور شوشوں کو بہت اہمیت حاصل ہوتی ہے۔پڑھنے کے لیے نقطوں اور شوشوں کو گننے میں بڑی زحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اور تحریر کو صحت کے ساتھ پڑھنے کے

لیے سیاق وسباق کا علم ضروری ہے، کوئی بھی نیا لفظ مشکل سے پڑھا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے
لغت کا سہارا ناگزیر ہوتا ہے۔'' (۲)

اس قسم کی نکتہ چینیوں کے علاوہ ہندوستان میں مسائل اس لیے بھی زیادہ گھمبیر رہے کہ یہاں مسئلہ صرف رومن کا نہیں تھا۔ ادھر زبانوں پر اپنوں کے بیچ جو سیاست شروع ہوئی اس نے تنازعات کی پٹاریاں کھول دیں۔ یہاں کی سیاست بھی اگرچہ رومن کے خلاف تھی تاہم عربی و فارسی طرزِ تحریر کے مقابلے میں وہ نسبتاً متروک اور غیر مقبول بھاشاؤں کے حق میں تھی:

''چند مستثنیات سے قطع نظر ہندی اور اردو دونوں کے حامیوں نے رومن رسم خط کی تحریک کی
پرزور مخالفت کی۔ رومن رسم خط کے خلاف اکثر و بیشتر وہی دلیلیں پیش کی گئیں جو اردو اور
ہندی کے حامی ایک دوسرے کے خلاف استعمال کرتے تھے۔'' (۳)

گویا دیوناگری ہو یا رومن یا کوئی اور طرز املا۔ ہر صورت میں اردو کو چیلنجز کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ چیلنجز تقسیم کے بعد نئے سے نئے سوالات کی صورت میں ابھرتے گئے۔ ڈاکٹر ہارون ایوب لکھتے ہیں:

''آزادی کی جدوجہد میں جتنا اہم رول اردو زبان نے ادا کیا ہے۔ شاید ہی کسی زبان نے کیا
ہو۔ لیکن آزادی کے بعد سب سے زیادہ نقصان اسی زبان کو اٹھانا پڑا۔'' (۴)

ڈاکٹر صاحب کے بیان کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ اردو مسلسل کٹھنائیوں سے گزری ہے۔ علامتوں سے زبان تک اور زبان سے علامتوں تک کے سفر میں جہت در جہت اس نے مختلف راستے تراشے، اپنے تہذیبی پس منظر کے وسیع تال میل میں ہیئتی سانچوں، تکنیکی معیارات، اسلوبی جمالیات، اصناف اور موضوعات کے بے پناہ سرمائے سے مالا مال ہوتی یہ زبان حالات کی ضربیں کھا کھا کے وقت کی رفتار کا ساتھ دیتے ہوئے ہمیشہ مبارزہ طلب محاصروں سے نبرد آزما رہی۔

یہ چیلنجز معروضات کی دنیا میں صورتوں پہ صورتیں بدلتی رہیں لیکن اردو تھی کہ نہ تو بدلتی بگڑتی شکلوں سے گھبرائی نہ ہی پیش آمدہ مشکلوں سے۔ اتہاس کے سمندر میں مدوجزر آتے رہے۔ وقت کے آسمان پر صدیاں طلوع و غروب ہوتی رہیں۔ لیکن اردو اپنی اثر آفرینی میں حیرت خیز طلسم کاریوں کے ساتھ موجود رہی۔ یہ عجوبہ کبھی آپس کی لڑائیوں کی زد میں رہا تو کبھی اس کے بغیر غیروں کے لیے بھی چلنا دشوار ہو گیا۔ کہیں اس کی جادو اثری نے درباروں کو اسیر کر لیا تو کہیں مستشرقین کے دلوں کو تسخیر کر لیا۔ کہیں اس کا تلاطم کماں بدست محاصروں سے جا ٹکرایا تو کہیں خلعت فاخرہ دینے والے درباروں کو ٹھکرایا۔ کہ اسکی روح زیادہ دیر تک گھٹن گوارا نہیں کر سکتی تھی۔

اگرچہ خواص پسند رہی پر گفتگو اس نے ہمیشہ عوام سے کی، سو کہیں بزم آرائیوں کو محظوظ و مسرور رکھا تو کہیں رزم گاہوں میں فولادی عزم کی ترجمان ٹھہری۔ ایک دور اس سے غم غلط کرنے والا تو دوسرا اس کے لیے غم اندیش رہنے والا۔ سرکاروں میں اس لیے نہیں چل سکی کہ سرکاریں توڑم توڑی میں مصروف رہیں اور یہ آگے بڑھتے رہنے میں۔ لیکن زبان توڑنے والوں کو بھی جب جب احتیاج پڑی، اسی کے روزمرہ، محاوروں، مصرعوں اور ضرب الامثال کو کام میں لاتے گئے۔ ایک بنجارے کی طرح عوامی میلوں ٹھیلوں، فقیروں کے تکیوں، خانقاہوں، آستانوں اور درگاہوں میں نغمہ سرا رہی۔ کبھی لکھنؤ تو کبھی دہلی، کبھی رام پور تو کبھی دکن، کبھی کراچی تو کبھی لاہور، کبھی پشاور تو کبھی کشمیر میں حریت فکر و نظر کی اساس سمجھی گئی۔ رومان کے سمن زاروں سے حقیقت

کے خارزاروں تک ان گنت منزلیں سر کرتی دہلی سے لکھنؤ تک بیل گاڑی تو امرتسر سے لاہور تک ریل گاڑی میں سفر کرنے والی یہ زبان جیل گاڑی میں بھی مساوات اور محبت و یگانگت کے الاپ بکھیرتی رہی۔ ہجرتوں کے دکھ سہنے اور فسادات میں امن کا پیامبر بننے والی اس زبان کو آج سماج میں تہذیبی انتشار کا سامنا ہے۔

گذشتہ دور میں جب معاشرے کی تہذیبی بنیادیں مضبوط تھیں۔ زبان و ادب نے ریشہ ریشہ مضبوط روایات پر سماج کے ساتھ گہرا سمبندھ جوڑے رکھا لیکن فی زمانہ اقدار کے سانچے جس طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئے ہیں۔ زبان اور لفظوں کی تہذیب بھی بری طرح اس ریلے کی لپیٹ میں آ گئے ہیں۔ یہاں مطلب جدید ٹیکنالوجی کے مصائب و نقائص کی فہرست بنانے سے نہیں۔ صرف یہ بتانا ہے کہ ہمارے معاشرے میں لطیف معیارات اور اسلوب زندگی کے باب میں جو ترجیح زبان و ادب کو دی جاتی تھی وہ سکرینوں پر چل رہے تماشوں اور بے ہودگیوں میں الجھ کر رہ گئی۔ بقول گوپی چند نارنگ:

''ہم ایک تماشائی سماج کا حصہ بنتے جا رہے ہیں۔''(۵)

انٹرنیٹ اور کمپیوٹر کی افادیتوں سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ کچھ عرصہ پہلے تک یہ شکایتیں ضرور تھیں:

''انٹرنیٹ اپنی تمام تر وسعتوں کے باوجود اردو دنیا کے لیے بہت زیادہ سودمند ثابت نہیں ہو سکا کیوں کہ اس کی وسعتوں کے اعتبار سے اردو میں اس کا استعمال محدود ہے۔''(۶)

لیکن اب ایسے ویب سائٹس کھل رہے ہیں جو اردو کی نشر و اشاعت کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ با ایں ہمہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ بے شک صارفیت کے چکر نے اردو کو کمپیوٹر انٹرنیٹ اور چینلز کی زبان تو بنا دیا ہے لیکن ضرورت ہے ذوق کی تربیت اور سنجیدگی سے اعلیٰ تخلیقی اور تحقیقی کام کرنے کی۔ یاد رہے کہ جس عہد میں ہم سانس لے رہے ہیں یہ وہ نسل نہیں جہاں سینہ بہ سینہ روایتوں کے خزینے منتقل ہوتے تھے۔ گذشتہ زمانوں کی خوش سلیقگی کو اگر ہم زبان کی سطح پر بنا کچھ پڑھائے، بنا سمجھائے بتائے نئی نسل میں ڈھونڈیں گے تو ہمیں ناکامی ہوگی۔ حال ہی میں ایک کالج کی بزم ادب نے سالانہ تقریب میں آنے کی دعوت دی۔ اسٹیج پر ڈرامہ پیش کرنے سے قبل جو بچے ابھی ریہرسل میں مصروف تھے انھوں نے ہاتھوں میں رومن سکرپٹ پکڑ رکھا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت اُردو کو جن شعبوں میں مشکلات درپیش ہیں اُن میں اہم اور کلیدی شعبہ درس و تدریس کا ہے۔

ایسے میں شکایت اپنے آپ سے بھی کرنا ہوگی۔ اس دور میں ایسے ایسوں کی کمی نہیں جو مانگے کا اجالا لے دے کے مشاعروں میں خوامخواہ کی داد بٹور رہے ہیں۔ ڈاکٹر شفیع ایوب کے مطابق:

''راقم السطور کئی ایسے 'استاد' شاعروں سے واقف ہے جو الگ الگ شہروں میں الگ الگ۔۔۔۔ کو اسٹار بنانے کا ہنر جانتے ہیں۔۔۔۔ یہ منظر اب مشاعروں میں عام ہے۔ یہ منظر شرمناک ہے اور زبانِ اردو کے فروغ سے اس کا کچھ لینا دینا نہیں ہے۔۔۔۔ اور اسی سے کرپشن کو فروغ مل رہا ہے۔''(۷)

اس دس نمبری کی مثالیں ہمارے گرد و پیش میں بہت ملیں گی۔ گذشتہ دنوں امریکہ میں مقیم ایک متشاعرہ نے اپنے نام سے کتاب شائع کی جس پر پاکستان کے ایک نامی گرامی ڈرامہ نگار نے توصیفی فلیپ لکھ کر اسے عہد حاضر کی بڑی آواز قرار دیا۔ حالانکہ خود اسی شاعرہ سے سننے میں آیا کہ اس مجموعے کی کونسی غزل کتنے کے عوض کہاں سے ملی۔ آج کل وہ دوسرا مجموعہ

چھاپنے کی فکر میں ہے لیکن اب کی بار اس کا ماننا ہے کہ اُس نے کم قیمت پر کتاب شائع کرنے کا گُر سیکھ لیا ہے۔

تو صاحبو! لسانی فرقہ واریت کو ختم کرنے کے ساتھ ساتھ اردو کو اس بدعنوانی کا بھی مقابلہ کرنا ہے جس نے تخلیق کے ساتھ ساتھ تحقیق کا بھی بوریا بستر گول کر دیا ہے۔ یوں کہ اب چربہ سازوں اور جینوئن تخلیق کاروں کے درمیان لکیر کھینچا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ ڈھول کا پول کیا کھلے کہ اب مستعار فکر کے کلیشے مارکیٹ کا من بھاتا کھاجا ہے۔

چیلنجز تو اس تنقید کے بھی ہیں جس کا تخلیق کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ نصف صدی سے بھی آگے جمیل جالبی نے تخلیق اور تنقید کے رشتے کو اجاگر کرتے ہوئے کہا تھا:

> ''تخلیقی قوت اپنے جوہر اس وقت تک بہترین طور پر دکھا سکتی ہے جب تخلیق کا مواد تنقید نے اس طور پر تیار کر دیا ہو کہ فنکار خدائی صفات سے اسے ایک نئے رشتے میں پرو کر ایک وحدت بنا دے اور اس دور کی ساری مقامی اور آفاقی خصوصیات اس میں تحلیل ہو جائیں گے۔''(۸)

سو گلوبل ویلیج کے خاکستر میں نئی چنگاریاں ڈھونڈنے کے لیے تنقید کا رشتہ پھر سے تخلیق کے ساتھ جوڑنا ہوگا۔ اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ سنجیدگی سے اپنے اہداف کا تعین کیا جائے۔ اس ضمن میں ادیب کو سوچنا ہوگا کہ وہ کیوں لکھ رہا ہے اور کس کے لیے لکھ رہا ہے وہ عہد حاضر کا ترجمان ہے یا گزشتہ مرقومات کی جگالی؟ وہ قلمکار کہلوانا پسند کرے گا یا کسی کا آلہ کار؟ کیا اس کو اپنی آواز سنائی دے رہی ہے؟ وہ اپنے خون جگر سے تخلیق کی آبیاری میں مگن ہے یا کسی کا لکھا ہوا کسی کو فارورڈ کرنے میں مصروف۔ بے شک یہ زمانہ ملٹی لینگولزم کا ہے اس لیے علم و حکمت کی روشنی کے لیے نئے علوم کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کے لیے بھی اپنے دروازوں کو کھلا رکھنا ہوگا لیکن شوشوں پر شوشے چھوڑنے کی بجائے اپنی پہچان کے لیے ترجیحی بنیادوں پر اس زبان کے فروغ کے لیے کام کرنا ہوگا جو زبان جو ہمارے ثقافتی تشخص اور صدیوں کے تہذیبی سرمائے کی آئینہ دار ہے۔

حوالہ جات

۱۔ گارساں دتاسی، خطباتِ گارساں دتاسی، اورنگ آباد: انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۵ء، ص:۳۵۸

۲۔ ایضاً، ص:۲۸۵

۳۔ حکم چند نیئر، ڈاکٹر، اُردو کے مسائل، لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، اگست ۱۹۷۷ء، ص:۷۰

۴۔ ہارون ایوب، ڈاکٹر، اُردو تدریس کے مسائل، مدھیہ پردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۳ء، ص:۱۰۴

۵۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ سے راقم الحروف کا مکالمہ، کراچی: نومبر ۲۰۰۸ء

۶۔ اکرام، خواجہ، ڈاکٹر، اردو زبان کے نئے تکنیکی مسائل اور امکانات، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دسمبر ۲۰۱۲ء، ص:۲۲

۷۔ شفیع ایوب، ڈاکٹر، مانگے کا اُجالا، مشمولہ: ایشیا ٹائمز ڈیسک، ۲۷ جنوری ۲۰۱۹ء

۸۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تنقید اور تجربہ، کراچی: مشتاق بک ڈپو، اگست ۱۹۶۷ء، ص:۴

☆.....☆.....☆